کے امتیاز کے پیمانہ کے بارے میں) اللہ تعالیٰ سے ڈرو اے عقلمندو! (اور اپنی طرف سے حق و باطل کا معیار مثلاً۔ اکثریت (جمہوریت) نہ بناؤ۔ کیونکہ کثرت شر و خُبث کی رہی ہے) تاکہ تم مکمل کامیابی (فلاح) حاصل کرو۔"

لیکن جمہوری نظریہ اصرار کرتا ہے کہ جس طرف جمہور ہوں ان کی بات تسلیم کی جائے۔ ان کے حق میں فیصلہ دیا جائے یہ بات کسی حد تک دل کو لگتی بھی ہے۔ مگر جمہور بدی کے دل دادہ اور برائی کے دعویدار ہوں تو پھر؟ قرآن کریم کا اندازِ بیان بتاتا ہے کہ بدی کے خواہشمندوں کی ہمیشہ کثرت رہی ہے۔ اس لئے ایسی اکثریت (جمہوریت) بے ایمانوں، ملحدوں، زندیقوں، فاسقوں، فاجروں، دین و دانش سے آزاد محققوں، عقل و فکر سے کورے اربابِ فکر و فلسفہ کے لئے اپنے اندر بے پناہ کشش رکھتی ہے۔ اسلام کتنی معقول بات کہتا ہے کہ حق کا ساتھ دو۔ مظلوم کا سہارا بنو اگرچہ وہ ایک ہو، کمزور ہو، غریب ہو۔ اسی مذکورہ بالا آیتِ کریمہ میں فرمایا کہ جمہوریت کی اس تعجب خیزی اور سراگیدی سے بچنے کے لئے مجھ سے ڈرو، تقویٰ اختیار کرو۔ ایسی خبیث جمہوریت کو چھوڑ کر میری سنو۔ نیز اسی آیتِ طیبہ میں یہ بھی واضح کر دیا گیا کہ ایسے "تہذیب نایافتہ" نادان کبھی فلاح کے قریب بھی نہیں بھٹک سکتے۔ ہر سمجھدار اور دیانت دار مسلمان خود فیصلہ کر سکتا ہے کہ جمہوریت عین اسلام ہو سکتی ہے؟ اور اسلام کے کامل و جامع ہونے کی صورت میں بھی "اسلامی جمہوریت" کی اصطلاح کی ضرورت پڑتی ہے تو کیا اسلام نامکمل نہیں ہے؟ (العیاذ باللہ) اسلام اور جمہوریت میں "عینیت" ثابت کرنے والے یا تو پرلے درجے کے گھامڑ اور کودن ہیں اور یا پھر انتہائی شاطر مفاد پرست! آج وقت کا سب سے اہم تقاضا ہم سے یہی ہے کہ ہم شرعی برہمنوں اور سیاسی پنڈتوں کی اس خوفناک چال کو سمجھیں اور پاکستان میں نفاذِ اسلام کی منزل کھوٹی نہ ہونے دیں ——— کاش ہم سمجھ پائیں کہ سچ کہا تھا اکبر نے ؎

عزیز لڑتے ہیں آپس میں یہ ستم کیا ہے
خدا کی مار سے دولوں کی مار کم کیا ہے

بقیہ از ص ۳۹

اتنی روانی اور صفائی نہیں جتنی روانی اور صفائی مولانا کے افکار و خیالات میں پائی جاتی ہے۔ ان کا قلم میدانِ اسلام میں اس طرح چلتا ہے جیسے قرونِ اولیٰ کے غزوات نے اپنے چہروں سے نقاب الٹ دیئے ہوں۔"

تقریر کے آخر میں آغا مرحوم نے ۱۹۶۵ء کی جنگ کا پس منظر بیان کیا۔ دراصل اس جنگ کے حوالے سے وہ قوم کے جذبوں اور حوصلوں کو بیدار رکھنا چاہتے تھے۔ انہوں نے کہا "جب لاہور کے محاذ پر رات توپ چلتی تھی۔ تو لاہور کے در و دیوار اس طرح کانپتے تھے، جیسے رات کے اندھیرے میں گنہگار کا دل کانپتا ہے۔ میری مائیں، بہنیں اور بیٹیاں مصلّے پر بیٹھی دعائیں مانگتی تھیں مجھے یوں لگتا تھا جیسے اُن کی پلکوں پر لرزنے والے آنسو طورِ سینا کے جلوے بن کر محاذ جنگ میں ہمارے سپاہیوں کی رہنمائی کر رہے ہیں۔" آغا صاحب کی تقریر ڈیڑھ گھنٹے سے تجاوز کر رہی تھی۔ رات کافی جا چکی تھی۔ وہ مریض ہونے کے باوجود اتنے تھکا دینے والے سفر پر رواں دواں تھے۔ اب ان کے لہجے پر اضمحلال غالب آ رہا تھا، وہ یہ آخری جملہ کہہ کر دفعتاً بیٹھ گئے،

"مسلمانو! یاد رکھو محمدؐ سے وفا کرو گے، تو اس طرح چمکو گے جیسے صبح کا آفتاب چمکتا ہے، ورنہ اس طرح مٹ جاؤ گے جیسے قرطبہ اور غرناطہ سے مسلمان مٹ گئے تھے۔"

●●

خالد ھمایوں

آغا شورش اور علامہ احسان کے جلسے میں

گجرات میرا آبائی شہر تو نہیں لیکن وہاں بیس سال گزارنے کے بعد میرے دل میں اس کا قیام جدی پشتی شہر سے کسی طرح بھی کم نہیں۔ روزگار کی مجبوریاں لاہور لے آئی ہیں، ورنہ جی چاہتا تھا کہ انہی گلی کوچوں میں گھومتے پھرتے عمرِ مستعار کا باقی حصہ بھی بیت جائے۔ سرسید نے اس شہر کو بجا طور پر خطۂ یونان کا خطاب دیا تھا۔ اس نے ایسے ایسے نابغہ روزگار لوگ پیدا کیے ہیں کہ جن کے کارناموں کا چار دانگِ عالم میں شہرہ ہے۔

کبھی کبھی موقع نکل آتا ہے تو ساری مصروفیات تج کر گجرات جانا پڑتا ہے۔ دریائے چناب پار کرتے ہی یادوں کے دریچے وا ہو جاتے ہیں اور ماضی کے بے شمار مذہبی، سیاسی اور ادبی ہنگامے اپنی تمام رونقوں کے ساتھ نگاہوں کے سامنے ابھرتے لگتے ہیں۔

۱۹۷۰ء میں گجرات میں ایک ایسا عظیم الشان جلسہ منعقد ہوا تھا جس کی یاد آج بھی میرے ذہن کے افق پر ستاروں کی طرح جگمگا رہی ہے۔ اس جلسے کے دو بڑے مقرر تھے، آغا شورش کاشمیری مرحوم و مغفور اور علامہ احسان الٰہی ظہیر شہید۔ دونوں کی تقریریں عوام نے بے حد ذوق و شوق سے سنیں اور کئی دن تک سر دھنتے رہے۔ ملکی انتخابات ہونے والے تھے۔ سیاسی فضا آتش بار تھی، اس لیے ہر دو صاحبان کی تقریروں میں بھی سمندروں کا خروش تھا۔ علامہ صاحب غالباً پہلی دفعہ عوامی جلسوں کی اتنی بڑی مہم سر کرنے نکلے تھے۔ انھوں نے اپنی تقریر میں زیادہ تر آغا صاحب کے سیاسی مخالفین کو آڑے ہاتھوں لیا جو تہمتوں کی راکھ اڑاتے ہوئے بے قابو ہو رہے تھے۔ تقریر کیا تھی، یوں لگتا تھا جیسے شیر دھاڑ رہا ہو۔ البتہ آغا صاحب کی تقریر ادب اور سیاست کا خوبصورت آمیختہ تھی۔ اس تقریر کے بہت سے حصے میرے ذہن میں محفوظ رہ گئے ہیں۔ خطبہ مسنونہ کے بعد مجھے یاد پڑتا ہے، آغا صاحب ان الفاظ کے ساتھ سامعین سے مخاطب ہوئے تھے:

"مجھ سے پہلے میرے عزیز بھائی حافظ احسان الٰہی ظہیر نے جس قہر و غضب کے انداز میں اپنے خیالاتِ عالیہ کا اظہار کیا ہے اور جس روانی اور طغیانی سے اپنی موجوں سے آپ کے دامنِ سماعت کو دھونا چاہا ہے، میں اس میں مزید کوئی اضافہ نہیں کر سکتا۔ اپنا اپنا انداز، اپنا اپنا ڈھب، اپنا اپنا رُخ، اپنے اپنے تیور اور اپنا اپنا اسلوب ہوتا ہے اور آدمی اپنے جذبات کو اس سانچے میں ڈھال کر پیش کرتا ہے۔"

"آج جب میں یہاں آ رہا تھا یا جب یہاں کے دوست مجھے وہاں بار بار دعوت دینے کے لیے بلاتے تھے، بات چیت کرتے تھے اور اُن بھائیوں کے متعلق جو ہماری مخالف صف میں ہیں، ان کے تذکرے بیان کرتے تھے اور حکایتیں بیان کرتے تھے، تو ظاہر بات ہے جو باتیں وہ بیان کرتے تھے میں سُنتا تھا لیکن آویزۂ گوش نہیں بناتا تھا، بس یُوں سمجھتا تھا کہ صرصر کی ایک موج آتی اور نکل جاتی ہے۔ جہاں تک حافظ صاحب کا تعلق ہے مجھے ان کے جذبے میں، ان کے ولولے میں، ان کی خطابت میں اور اُن کے ایمان میں رتی بھر شبہ نہیں، وہ مدینہ یونیورسٹی کے فارغ التحصیل ہیں، بڑے عالم اور فاضل آدمی ہیں، مستقبل انہی لوگوں کے ہاتھ میں ہے، ہم لوگ تو اب چراغِ سحری ہیں۔

کل جی کا جانا ٹھہر گیا ہے صبح گیا یا شام گیا

جی! اور سے

کھو چکا جو جوشِ طاقت اب ملے دشوار ہے
حشر میری سمت اب گرتی ہوئی دیوار ہے

تو اس لیے ایک قافلہ، بہت پرانا قافلہ، جو کبھی چلا تھا یہاں گجرات ہی سے چلا تھا، اور ایک شخص اٹھا تھا دیوانہ، جس کے بالوں کی جنبش کے ساتھ کائنات بھی جنبش کیا کرتی تھی، اس قافلے کا ایک بچھڑا ہوا مسافر میں بھی ہوں۔ وہ قافلہ اپنی منزل پر پہنچ گیا ہے اور میں منزل کے قریب آ گیا ہوں۔"

"دیوانے" سے مراد رئیس الاحرار سید عطاء اللہ شاہ بخاری مرحوم و مغفور کی ذات گرامی ہے۔ ان کا آبائی وطن گجرات تھا۔

آغا مرحوم کی تقریر مرصع الفاظ اور عمدہ نادر خیالات کا ایک سیلابِ بلا تھی۔ ان کے سامنے سامعین کا ایک ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر تھا۔ وہ الفاظ کی موجیں اُچھال رہے تھے۔ آہ اور واہ کا دلآویز سماں بندھ گیا تھا۔ آغا صاحب کہہ رہے تھے:

"حافظ جی نے جو کچھ کہا ہے، غلط نہیں کہا۔ اس لیے کہ جب ان کے دوستوں کی، ان کے رفیقوں کی اور ان کے اکابر کی توہین کی جائے گی، اہانت کی جائے گی، تو جب تک آدمی آگ، ہوا اور مٹی کا بنا ہوا ہے اُسے غصہ آئے گا اور وہ غصے میں ایسی باتیں کہہ جائے گا، لیکن میرا معاملہ تو بقول ناسخ کے ہے سے

اُن کو آتا ہے پیار پر غصہ
مجھ کو غصے پہ پیار آتا ہے

ہمارے دوستوں نے ہمارے متعلق کہا، جس لیجے میں کہا، جس قہر میں کہا، جس غضب میں کہا، جس روانی میں کہا، جس طغیانی میں کہا، جس پس منظر میں کہا، جس پیش منظر میں کہا اور جس تہہ منظر میں کہا، ہو سکتا ہے، اس میں کوئی صداقت ہو، آخر ہم بھی انسان ہیں، اور سے

کیوں گردشِ مدام سے گھبرا نہ جائے دل
انسان ہوں پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں

اگر ہم میں گناہ نہ ہوتے، معصیت نہ ہوتی، عصیاں شعاری نہ ہوتی، تو پھر رحمتہ اللعالمینؐ کے تشریف لانے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ آج یہاں گجرات کے ذہین لوگ بیٹھے ہیں، فطین لوگ بیٹھے ہیں (چھتوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) حسین لوگ بیٹھے ہیں، نازنین بیٹھے ہیں اور مہ جبین بیٹھے ہیں، آج میرا بھی جی چاہتا ہے کہ کچھ ایسی باتیں کہتا جاؤں، بقول حفیظ کے:

میرے چُپ رہنے کی عادت جس کارن بدنام ہوئی
اب وہ حکایت عام ہوئی ہے سنتا جا شرماتا جا

یا بالفاظِ دیگر سے

رہیں گی بعد میرے بھی یُوں ہی رسوائیاں میری!
جو چُپ ہوں گا تو پھر دنیا کہے گی داستاں میری

اور اب ان دونوں کو سرلوط کرنے کے بعد فانی کے اس شعر کی طرف آیئے سے

اے اہلِ حشر ہے کوئی نقادِ سوزِ دل
لایا ہوں دل کے داغ نمایاں کیے ہوئے

اس لیے میرے پاس تاریخ اور خیالات کی کمی نہیں، شاید چناب کے پانی میں اتنی موجیں نہ ہوں، جتنی خیالات کی لہریں میرے دماغ میں کروٹیں لے رہی ہیں، آپ جس موضوع پر کہیں گے میں تقریر کروں گا۔"

آغا صاحب کہا کرتے تھے مجھے فارسی اور اُردو کے ایک لاکھ اشعار یاد ہیں۔ گجرات میں اپنی تقریر کے دوران موقع اور محل کے مطابق انہوں نے بے شمار اشعار سنائے۔ عوام ان کی طلاقتِ لسانی پر انگشت بدنداں تھے۔ تقریر کے دوران کسی کونے سے زوردار نعرہ گونجا: "آغا شورش کاشمیری زندہ باد" آغا کہنے لگے "بھئی یہ نعرہ نہ لگائیں۔ آپ لوگوں کا کیا اعتبار! یاد ہے میں سہروردی کے ساتھ آیا تھا تو آپ لوگوں نے ہاتھ اٹھا کر کہا تھا، ہم آپ کے ساتھ ہیں تو میں نے کہا تھا، آپ کے تو کبھی گھوڑوں نے وفا نہیں کی، ہم سے کیسے کرو گے"! سارا مجمع قہقہوں سے گونج اُٹھا۔ پھر آغا کہنے لگے، میں نے کہا تھا سے

ساقیو بادہ کی بزم اُن سے ملاقات کی رات
آج تک یاد ہے شورش مجھے گجرات کی رات

اور پھر اُسی پر آغا حشر نے کہا تھا سے

اب کہاں جاؤ گے رہ جاؤ یہیں رات کی رات
میرے گھر آئی ہے تقدیر سے برسات کی رات

حافظ احسان الٰہی ظہیر نے اپنی تقریر میں گلہ کیا تھا کہ ہمارے مخالفین الزام تراشی کرتے ہوئے ذرا بھی غیرت محسوس نہیں کرتے آغا صاحب نے اس ضمن میں کہا: "دراصل ہمارے حریفانِ غزوایہ تھی داستانِ حیرت ہو گئے ہیں"۔ یہ جملہ پھر دہرایا اور سامعین سے پوچھا "کیوں گجراتیو! کچھ سمجھ وچ آئی گل؟" سامعین نے جواب دیا "بالکل نہیں"۔ کہنے لگے: "ایک دفعہ اسی طرح لدھیانے کے ایک گاؤں میں شاہ جیؒ تقریر کر رہے تھے۔ موضوع واقعہ معراج تھا۔ شاہ جی نے کہا: "اللہ دا محبوب جدوں اللہ نوں ملن چلیا تے کائنات رُک گئی"۔ لوگوں سے پوچھا "کیوں جی سمجھ وچ آئی گل"؟ پھر شاہ جی نے کئی مترادفات بولے، تھم گئی، ٹھہر گئی، مگر بات پلے نہ پڑنے تھی نہ پڑی۔ آخر شاہ جی نے اپنے بالوں کو دی جنبش، اور جانتے ہو نا شاہ جی کی زلفوں کو کہ سے

شبِ غم کی دست درازیاں تیرے گیسوؤں پہ نثار ہوں
میری بے کسی کی قسم تجھے میری بے کسی پہ الم نہ کر

شاہ جی نے دی جنبش اور پھر کہا سے

تیرے لونگ دا پیا لشکارا تے ہالیاں نے ہل ڈک لئے